لباس کا مسئلہ

اجتماعی اور شرعی نقطۂ نظر سے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لباس کا مسئلہ

اجتماعی اور شرعی نقطۂ نظر سے

اگر تمدن کے پیدا کردہ زوائد سے الگ کر کے لباس کو محض اس فطری احتیاج کے لحاظ سے دیکھا جائے، جس نے اوّل اوّل انسان کو اس کے اختیار کرنے پر اکسایا تھا، تو وہ صرف ایک ایسی چیز ہے جو شرم وحیا کے فطری جذبات کے تحت جسم کے خاص حصوں کو چھپائے اور موسمی اثرات سے اس کو محفوظ کرے۔ اپنی سادہ صورت میں ایسا لباس جو ان دو ضرورتوں کو پورا کرتا ہو، قریب قریب ایک ہی وضع کا ہونا چاہیے۔ کیوں کہ سب انسانوں کے جسم ایک سے ہیں، اور ان کو چھپانے کی آسان اور متبادل صورتیں بھی ایک ہی سی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ موسموں کے اختلاف کی بنا پر ان کی صورتوں میں اتنا اختلاف ہو سکتا ہے کہ جہاں گرمی ہو وہاں کے لباس ہلکے اور کم حصۂ جسم پر حاوی ہوں۔ اور جہاں سردی ہو وہاں کے لباس بھاری اور زیادہ حصۂ جسم پر چھائے ہوئے ہوں۔

قدیم ترین انسانوں کے متعلق جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں، ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ لباس جس زمانے میں محض فطرت کے ابتدائی اقتضا، اور مجرد انسانی ضروریات پر مبنی تھا، اس وقت اس کی صورتوں میں کچھ زیادہ تنوّع نہ تھا، اور جو کچھ تھا بھی تو وہ زیادہ تر موسمی اثرات کے اختلاف کی بنا پر تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب انسان کے شعور نے ترقی کی، تہذیب کی طرف قدم بڑھایا، صنعتیں پیدا ہوئیں، نئے نئے وسائل دریافت کیے گئے، اور اس فطری ملکہ نے انسان کے مزاج میں نشو و نما پایا جسے ”مذاق“ کہتے ہیں، تو رفتہ رفتہ فطرت کی ابتدائی ضروریات پر کچھ اور چیزوں

کا اضافہ ہونے لگا۔ یہ نئے آنے والے اثرات چوں کہ مختلف قوموں میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف تھے، اس لیے مختلف قوموں نے ابتدائی فطری لباس پر جو اضافے کیے وہ بھی اپنی صورتوں اور کیفیتوں کے لحاظ سے لامحالہ مختلف ہی ہونے چاہییے تھے، اور فی الواقع مختلف ہوئے بھی۔

مختلف قوموں میں لباس کی مختلف وضعوں کی پیدائش اور پھر ان کا تغیر و تبدّل اور نشو و ارتقا جن بے شمار چھوٹے بڑے اسباب کے زیرِ اثر ہوتا ہے، ان سب کا احاطہ ناممکن ہے۔ ہزار ہا سال کے دوران میں قوموں کی اجتماعی زندگی اور ہر قوم کے افراد کی شخصی زندگی بے حد و حساب خارجی و داخلی تاثیرات سے متاثر ہوتی ہے جن کا ریکارڈ کہیں محفوظ نہیں رہتا۔ بلکہ بہت سے اثرات تو ایسے لطیف ہوتے ہیں کہ محسوس تک نہیں ہوتے۔ لیکن جزئیات سے قطع نظر کر کے اگر ہم ان بڑے بڑے عوامل کا استقصا کریں جن کے اثر سے مختلف قوموں میں مختلف طرزوں کے لباس رواج پاتے ہیں، تو وہ حسبِ ذیل آٹھ عنوانات کے تحت تقسیم کیے جا سکتے ہیں:

(۱) جغرافیائی حالات، جو ایک ملک کے باشندوں کو ایک خاص قسم کا لباس اور طرزِ معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

(۲) اخلاقی و مذہبی تصوّرات، جن کے اختلاف کی وجہ سے مختلف قوموں میں عورتوں اور مردوں کے لباس مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں۔

(۳) فطری مذاق، جس کا نشو و نما ہر قوم میں مختلف اثرات کے تحت مختلف طور پر ہوتا ہے۔ اور اسی اختلافِ مذاق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہر قوم کی پسند دوسری قوم سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی ہے۔

(۴) طرزِ معاشرت، جو ہر قوم کے مخصوص جغرافیائی، تمدنی، معاشی اور عقلی و اخلاقی حالات کے تحت ایک مخصوص صورت میں نشو و نما پاتا ہے، اور ہر قوم فطرتاً اسی وضع کا لباس اختیار کرتی ہے، جو اس کے عام طرزِ معاشرت سے مناسبت رکھتا ہو۔

(۵) معاشی حالت، جس کے تحت ایک قوم کے عام ذرائعِ کسبِ معیشت، اس کے پیشے، اس کی صنعتیں، اور اس کی مالی حالت (افلاس یا خوش حالی) سب چیزیں آ جاتی ہیں۔ ہر قوم کا لباس لازمی طور پر اس کے ان حالات کے مطابق ہوتا ہے اور ان کے تغیر کے ساتھ ساتھ فطرتاً لباس میں بھی تغیر ہوتا جاتا ہے۔

(۶) تہذیب وشائستگی، جس میں ہر قوم ایک خاص مرتبے پر ہوتی ہے اور اس کا قومی لباس لازماً اس کی تہذیب وشائستگی کے معیار کا ساتھ دیتا ہے۔

(۷) قومی روایات، جن کے تحت ایک نسل اپنے بزرگوں سے ایک خاص قسم کا طرزِ زندگی اور طرزِ لباس وراثت میں پاتی ہے، اور تھوڑا بہت تغیر وتبدل کر کے اپنے بعد کی نسل کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔ مظاہرِ زندگی کا یہ تسلسل درحقیقت قومی وجود کے تسلسل کا ضامن ہوتا ہے۔ اس لیے ہر قوم فطرتاً اس کو عزیز رکھتی ہے۔

(۸) بیرونی اثرات، جو ہر قوم کے خیالات اور طرزِ زندگی پر دوسری قوموں کے میل جول سے پڑتے ہیں۔ مگر یہ امر کہ ایک قوم کس حد تک اور کس طرح دوسروں سے اثر پذیر ہوتی ہے، بڑی حد تک اس کے سیاسی اور ذہنی واخلاقی حالات پر منحصر ہوتا ہے۔

یہ وہ بڑے بڑے عوامل ہیں، جو ایک قوم کے لباس، اور صرف لباس ہی نہیں بلکہ اس کی پوری اجتماعی زندگی پر ہمہ گیر اقتدار رکھتے ہیں اور ہر قوم کا لباس انھی کے مشترک عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس تجزیہ کی مدد سے جب ہم قومی لباس کے مسئلے پر نظر ڈالتے ہیں تو دو بنیادی حقیقتیں ہمارے ہاتھ آتی ہیں:

ایک یہ کہ لباس محض ایک بیرونی آلۂ ستر پوشی اور خارجی ذریعۂ حفاظتِ جسم ہی نہیں ہے، بلکہ قومی نفسیات، قومی تہذیب وتمدّن، قومی روایات، اور قوم کی اجتماعی حالت کے اندر بہت گہری جڑیں رکھتا ہے۔ وہ دراصل اس روح کا مظہر اور ذریعۂ نمود ہے جو جسمِ قومی میں کارفرما ہوتی ہے۔ ہر قوم کا لباس درحقیقت ایک زبان ہے، جس کے ذریعے سے اس کی قومیت کلام کرتی ہے اور دنیا کو اپنی اجتماعی شخصیت سے روشناس کراتی ہے۔

دوسری یہ کہ لباس کی تہہ میں جتنے عوامل کارفرما ہیں، جغرافیائی حالات کے سوا باقی سب کے سب ایسے ہیں جو ہر قوم میں ہر آن ایک غیر محسوس رفتار کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان میں کوئی چیز ساکن وجامد نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک فطرتاً تغیر پذیر ہے۔ اور ان کا تغیر وارتقا لازمی طور پر صرف لباس ہی پر نہیں بلکہ پوری قومی زندگی پر آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ایک ترقی کرنے والی قوم میں جب علوم وفنون پھیلتے ہیں، خیالات میں روشنی آتی ہے، صنعت وحرفت اور تجارت میں فروغ ہوتا ہے، معاشی حیثیت سے خوش حالی بڑھتی ہے، دوسری قوموں کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملتا ہے، اور ان کے اخلاق ومعاشرت اور تہذیب وتمدّن سے اس کو مختلف

قسم کے سبق حاصل ہوتے ہیں، تو قدرتی طور پر خود بہ خود اس کی اجتماعی زندگی میں ایک ارتقائی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے جذبات بدلتے ہیں۔ فطری مذاق سدھرتا ہے۔ طرزِ معاشرت میں خوبی و نفاست آ جاتی ہے۔ شائستگی کا معیار بلند ہوتا ہے۔ نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئی صورتیں اختیار کی جاتی ہیں۔ قومی روایات کا احترام زیادہ ستھری شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں کی تدریجی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی لباس بھی مادّہ و صورت دونوں کے اعتبار سے زیادہ حسین، زیادہ خوش وضع اور زیادہ شائستہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس ارتقائی عمل کی کسی منزل میں بھی اس کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ ساری قوم کے لیے لباس کی کوئی خاص تراش مقرر کرنے یا کسی خاص طرزِ لباس کو رائج کر دینے کی زحمت اٹھائی جائے۔ اجتماعی عوامل کی مشترک گردش کے اثر سے خود بہ خود ہی پرانے اوضاعِ لباس میں اصلاحیں ہوتی جاتی ہیں، نئی نئی وضعیں چل نکلتی ہیں، اور مجموعی حیثیت سے پوری قوم کا مذاق و مزاج اپنی افتاد و پرواز کے مطابق لباس کو بہتر بناتا چلا جاتا ہے۔

قومی لباس کی پیدائش، اس کے تغیر و تبدل اور اس کے نشو و ارتقا کی فطری صورت یہی ہے۔ اور اس کے برعکس غیر فطری یا مصنوعی صورت یہ ہے کہ ایک قوم کا لباس بہ تکلّف بدلوایا جائے اور کسی دوسری قوم سے اس کا لباس مانگ لایا جائے۔ جہاں تک نفسِ تغیر کا تعلق ہے، وہ فطری ارتقا کی صورت میں بھی ہوتا ہے اور غیر فطری انقلاب کی صورت میں بھی۔ مگر دونوں قسموں کے تغیر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی قسم کا تغیر ایسا ہے جیسے ایک درخت کا نشو و نما، کہ وہ جتنا بڑھتا ہے، اس کا رنگ روپ، جسامت، پھل پھول، پتّیوں اور شاخوں میں تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں، مگر ان تمام تغیرات کے باوجود درخت کی خودی جوں کی توں رہتی ہے۔ املی کا درخت ہے تو آخر وقت تک املی کا درخت ہی رہے گا، اور آم کا درخت ہے تو ارتقا کے ہر درجے میں اس کی آمیت بہ دستور قائم رہے گی۔ زمین، ہوا، پانی، گرمی، دھوپ، ہر ایک چیز سے وہ بہت کچھ لے گا، مگر جو کچھ بھی لے گا اسے اپنی خودی کا جز بنا لے گا۔ بہ خلاف اس کے دوسری قسم کا تغیر ایسا ہے جیسے ایک درخت چلا تو تھا املی ہونے کی حیثیت سے، مگر یکایک اس پر آم کی چھال لا کر چپکا دی گئی اور آم ہی کی شاخیں اور پتّیاں اس پر جڑ دی گئیں۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ عجوبہ فی الحقیقت ہے کیا۔ آم ہے کہ املی؟ اس طرح کے مصنوعی اور جعلی تغیرات سے فی الواقع کوئی حقیقی اور نتیجہ خیز تغیر پیدا نہیں ہوتا، بلکہ فطری ارتقا کے راستے میں الٹا خلل واقع ہوتا ہے۔

مگر جو لوگ اجتماعی مسائل میں کوئی بصیرت نہیں رکھتے اور محض سطحی نظر سے زندگی کے معاملات کو دیکھتے ہیں، وہ بچوں کی سی سادہ لوحی کے ساتھ یہ خیال کرتے ہیں کہ لباس اور طرزِ معاشرت کی کچھ ظاہری شکلوں کے بدل دینے سے ایک قوم فی الحقیقت بدل جاتی ہے۔

عموماً تغیرِ لباس کے حق میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس سے ایک پس ماندہ قوم کی ذہنیت بدلتی ہے اور سکون و جمود کی جگہ حرکت پیدا ہوتی ہے۔ تنزل وانحطاط کے دور کا لباس اتارتے ہی وہ تمام اندرونی کم زوریاں جو اس دور کے ساتھ مختص تھیں، اور وہ ساری دل چسپیاں جو اس دور کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھیں، یکا یک کافور کی طرح اڑ جاتی ہے اور نیا لباس پہنتے ہی، خصوصاً جب کہ وہ کسی ترقی یافتہ قوم سے لیا گیا ہو، قوم کے نفسیات اور اس کی زندگی میں ایک فوری تغیر واقع ہوتا ہے۔ اس میں خود بہ خود ترقی یافتہ ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو آگے بڑھی ہوئی قوموں کے برابر سمجھنے لگتی ہے۔ دوسری قومیں بھی اس کو اپنے برابر کا سمجھنے لگتی ہیں۔ اور جب وہ ترقی یافتہ قوموں کا سا طرزِ زندگی اختیار کر لیتی ہے تو اس میں انھی جیسی شائستگی، عملی سرگرمی اور فعالیت بھی پیدا ہو جاتی ہے، کیوں کہ مہذب اور فعال قوموں میں جو لباس اور طرزِ زندگی پیدا ہوا ہے اسے اختیار کرنا مہذب اور فعال بننے کے لیے ضروری بھی ہے اور مفید بھی ——— یہ اور اسی قسم کے بہت سے دلائل اس فعل کی تائید میں دیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب محض سطحی تخیلات ہیں جن کی تہ میں کوئی تفکر اور کوئی بصیرت نہیں ہے۔ پھر ان تخیلات کی سند میں بعض بڑی بڑی نامور شخصیتیں بھی پیش کی جاتی ہیں، اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان شخصیتوں کے نام سنتے ہی آدمی پر ہول طاری ہو جائے گا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جن کی سند پیش کی جاتی ہے فکر و بصیرت کے اعتبار سے ان کا درجہ بھی ان لوگوں سے کچھ زیادہ اونچا نہیں ہے، جو ان کی سند پیش کرتے ہیں۔ اپنے متبعین کی طرح وہ بے چارے خود بھی فکری حیثیت سے سطح بیں اور علمی حیثیت سے کم مایہ ہیں۔ ہنگامی حالات میں کام یاب تدبیریں اختیار کر کے اگر کسی فوجی جنرل نے اپنی قوم کو تباہی سے بچا لیا ہو تو بلاشبہ وہ قدر و منزلت کا مستحق ہے، مگر اس کی قدر اتنی ہی کی جا سکتی ہے جتنا وہ فی الواقع ہے، اور اسی حیثیت سے کی جا سکتی ہے، جس حیثیت سے اس نے کارِ نمایاں انجام دیا ہے۔ اس کے حقیقی مرتبے سے آگے بڑھا کر اسے مفکر اور مصلح اور معمارِ تہذیب و تمدن کی حیثیت دینا ایسی ہی بے عقلی ہے، جیسی یہ بات کہ ایک اچھے انجینئر نے اگر سیلاب کے آگے بند باندھ کر کسی بستی کو تباہی سے بچا لیا ہو تو اسے ہر معنی میں مدبرِ اعظم اور نجات دہندہ سمجھ لیا جائے اور کہا

جائے کہ اب محکمۂ حفظانِ صحت کا نگراں بھی اسی کو بنادو اور تعلیمات کی نگرانی بھی اسی کے سپرد کردو۔

اصولی حیثیت سے جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ تغیر پسند حضرات کے دلائل کی غلطی واضح کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ لیکن زمانے کی روش کے اثرات سے جو غلط فہمیاں عام طور پر دماغوں میں گھر کر چکی ہیں ان کا نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ میں اس کے خلاف میں اپنے دلائل زیادہ صراحت کے ساتھ بیان کروں۔

(۱) پہلے یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ لباس کی وضع قطع بہ جائے خود کوئی مستقل بالذات چیز نہیں ہے بلکہ بہت سے قدرتی اور اجتماعی عوامل کے مشترک عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ حقیقت اگر تسلیم کرلی جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان عوامل کے عمل سے کسی قوم میں جو خاص وضع لباس پیدا ہوئی ہو وہی اس کی فطری وضع ہے، اس کو ترک کر کے یکایک کوئی ایسی نئی وضع اختیار کرلینا جو مناسب طور پر ان عوامل کے مشترک عمل سے نہ پیدا ہوئی ہو بالکل ایک خلافِ فطرت وضع ہے۔

(۲) ایک قوم کے لباس کا نہایت قریبی تعلق اس کے طرزِ معاشرت سے ہوتا ہے اور اس کا طرزِ معاشرت اس کی پوری تمدّنی زندگی سے کئی طرح کے روابط اور مناسبتیں رکھتا ہے۔ لباس و طرزِ معاشرت کے فطری تغیرّات میں تو یہ تمام مناسبتیں برقرار رہتی ہیں، کیوں کہ اس صورت میں زندگی اپنے تمام شعبوں کے ساتھ بہ حیثیت مجموعی حرکت کرتی ہے۔ لیکن اگر غیر فطری طریقے پر تکلّف اور تصنّع کے ساتھ لباس و طرزِ معاشرت کو بدل دیا جائے، یا صرف لباس میں تغیر کر دیا جائے تو ساری اجتماعی زندگی میں ایک برہمی و بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ زندگی کے دوسرے شعبے اس تغیر کا ساتھ نہیں دیتے اور ایک دوسرے سے بے جوڑ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(۳) لباس کا شائستہ و خوب صورت ہونا اور ترقی یافتہ حالات کے مناسب ہونا دراصل اس پر منحصر ہے کہ قوم خود اجتماعی حیثیت سے ترقی کرے اور ایک شائستہ، متمدّن، خوش مذاق، روشن خیال اور عملی قوم بن جائے۔ اس راہ میں وہ جتنی آگے بڑھتی جائے گی اسی نسبت سے اس کے قومی لباس میں خود بہ خود اِصلاح ہوتی جائے گی۔ ترقی پذیر نفسِ اجتماعی آپ سے آپ خالص فطری طریقے سے بلا ارادہ اور بلا تکلّف کچھ اپنی پرانی چیزوں میں ترمیم و اصلاح کرے گا اور کچھ دوسروں کی مناسب چیزیں لے کر اپنے

ہاں اس طرح سجا لے گا کہ وہ موزونیت کے ساتھ اس میں کھپ جائیں گی۔ اصلاح و ترقی میں پیش قدمی کے اس فطری طریقے کو چھوڑ کر آنِ واحد میں ایک لباس کی جگہ دوسرا لباس بدل لینا ایسا ہی ہے، جیسے چھلانگ مار کر ایک حالت سے دوسری حالت میں پہنچ جانے کی کوشش کی جائے۔ اجتماعی زندگی میں اس قسم کی چھلانگیں مارنے سے کوئی حقیقی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

(۴) کسی قوم کی اجتماعی حالت کے ترقی کرنے سے پہلے اس کے لباس و معاشرت کو بلند کرنا اور اسے کسی ایسے مرتبے پر لے جانے کی کوشش کرنا جو اس کے حقیقی اجتماعی مرتبے سے اونچا ہو، بالکل ایسا ہے جیسے کسی نابالغ بچے کو ہیجان خیز ماحول میں رکھ کر، گرم گرم غذائیں اور تیز تیز دوائیں کھلا کر زبردستی حدِ بلوغ کو پہنچایا جائے۔ اس طرح کی غیر معمولی ''تبلیغ'' سے اس غریب بچے کے نظامِ جسمانی واحوالِ ذہنی میں جو شدید اختلال پیدا ہوگا، اسی پر اس برہمی وابتری کو قیاس کر لینا چاہیے، جو زبردستی ''مہذب وشائستہ'' بنائے جانے سے کسی قوم کے اجتماعی نظام اور اس کی ذہنی واخلاقی حالت میں برپا ہوگا۔

(۵) ایک قوم کی معاشی حالت جس طرزِ لباس و معاشرت کا بار برداشت کر سکتی ہو، اس سے زیادہ بھاری لباس و معاشرت کا بوجھ اس پر لاد دینا اسے عملاً تباہ کرنے کا ہم معنی ہے۔ لباس و معاشرت کے ساتھ وہ خوش حال قوموں کے دوسرے تمدّنی ڈھنگ اختیار کرنے کی بھی کوشش کرے گی، اور اس کے نتائج اس کے حق میں تباہ کن ہوں گے۔

(۶) لباس، زبان اور رسم الخط وہ اوّلین چیزیں ہیں، جن کے سہارے ایک قوم کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم کی قومیت کے ان سہاروں کو گرا دیا جائے تو اس کی انفرادیت آہستہ آہستہ محو ہونے لگتی ہے اور آخر کار وہ دوسری قوموں میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ قدیم زمانے کی وہ قومیں جو آج صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکی ہیں، اور جنھیں ہم امِ بائدہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، سب کی سب اسی وجہ سے فنا ہوئیں۔ ان کے فنا ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اشخاص جن پر وہ قومیں مشتمل تھیں، سب مٹ گئے اور کوئی نسل دنیا میں چھوڑ کر نہیں گئے۔ بلکہ دراصل ان کی گم شدگی اور فنائیت اس معنی میں ہے کہ ان کی قومی انفرادیت باقی نہیں رہی۔ انھوں نے اپنی قومیت کے سہاروں کو خود گرا دیا، یا گر جانے دیا۔ ان کے افراد دوسری قوموں کے لباس، زبان، رسم الخط اور آدابِ معاشرت

اختیار کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کی قومیت مضمحل ہوتے ہوتے ناپید ہوگئی۔ یہی حشر اب بھی ان قوموں کے لیے مقدر ہے، جو اپنے نادان لیڈروں کی احمقانہ تدبیروں کو ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کر رہی ہیں۔

(۷) ایک قوم کا دوسری قوم کے لباس وطرزِ معاشرت کو اختیار کرنا دراصل احتقارِ نفس کا نتیجہ اور اس کا اعلان ہے۔ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خود ذلیل، دنی اور پست سمجھتی ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں ہے جس پر وہ فخر کر سکے۔ اس کے اسلاف کوئی ایسی چیز چھوڑ جانے کے قابل ہی نہ تھے جسے وہ شرم کیے بغیر برقرار رکھ سکتی ہو۔ اس کا قومی مذاق اتنا پست اور اس کا قومی ذہن اتنا کند ہے، اور اس کے اندر تخلیقی قوتوں کا ایسا فقدان ہے کہ وہ خود اپنے لیے کوئی بہتر طرزِ زندگی پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے آپ کو مہذب دکھلانے کے لیے سب کچھ دوسروں سے مانگ لاتی ہے کہ تہذیب، شائستگی، حضارت اور حسن وجمال جو کچھ بھی ہے دوسروں کی زندگی میں ہے، وہی ہر کمال کا معیار ہیں اور ہم خود سیکڑوں ہزاروں برس کی زندگی میں گویا بس جانوروں کی طرح جیتے رہے ہیں۔ ہم کوئی چیز بھی ایسی پیدا نہ کر سکے جو قدر وعزت کے لائق ہو، یا زندہ رہنے کی مستحق ہو ــــــ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس قوم میں خودداری کا شائبہ بھی باقی ہو وہ اس طرح اپنی ذلت وپستی کا اشتہار بننا گوارا نہیں کر سکتی۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے اور خود موجودہ زمانے کے حالات جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس امر پر شہادت دیتے ہیں کہ اس حقیر وذلیل حیثیت کو ایک قوم دو ہی حالتوں میں گوارا کرتی ہے۔ (الف) یا تو اس وقت جب کہ وہ ہر میدان میں دوسری قوموں سے پٹ کر اور پیہم شکستیں کھا کر ہار مان لے اور ڈگیں ڈال دے۔ مثلاً ہندستان، ترکی، مصر، ایران وغیرہ۔ (ب) پھر اس صورت میں جب کہ فی الواقع اس کی پشت پر کسی قسم کی قابلِ فخر روایات (Traditions) نہ ہوں، اس کی اپنی کوئی تہذیب وثقافت پہلے سے نہ رہی ہو، اس میں اعلیٰ درجہ کی تخلیقی قوتیں بھی نہ ہوں، اور وہ اقوامِ عالم کے درمیان محض ایک نو دولیتے (Upstart) کی حیثیت رکھتی ہو، جیسے جاپان۔

(۸) ایک قوم کو دوسری قوم سے اگر کوئی چیز لینی چاہیے اور کوئی چیز درحقیقت لینے کے قابل ہے تو وہ محض اس کی علمی تحقیقات کے نتائج، اس کی تخلیقی واختراعی قوتوں کے ثمرات، اور اس

کے وہ عملی طریقے ہیں جن سے اس نے دنیا میں کام یابی حاصل کی ہے۔ اس کی تاریخ میں، یا اس کی تنظیمات میں، یا اس کے اخلاقیات میں اگر کوئی مفید سبق ہے تو اسے ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ اس کی ترقی اور کام یابی کے اسباب کا پوری چھان بین کے ساتھ استقصا کرنا چاہیے، اور ایک ایک چیز جو مفید ہو اسے لے لینا چاہیے۔ یہ چیزیں انسانیت کی مشترک میراث ہیں۔ ان کی قدر نہ کرنا، اور ان کے لینے میں قومی عصبیت کی بنا پر بخل کرنا محض جاہلیت ہے۔ لیکن ان چیزوں کو چھوڑ کر دوسری قوم سے اس کے پہننے کے کپڑے اور اس کے رہنے سہنے کے طریقے اور اس کے کھانے کی چیزیں مانگنا، اور انھی کو ترقی کا ذریعہ سمجھنا، بجز اس کے کہ کند ذہنی کی علامت ہے اور کچھ نہیں۔ کیا کوئی عقل مند ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ یورپ نے کوٹ، پتلون، ٹائی، کالر، ہیٹ، اور بوٹ کے ذریعے سے ترقی کی ہے؟ یا اس کی ترقی کے اسباب یہ ہیں کہ وہ چھری کانٹے سے کھانا کھاتا ہے؟ یا اس کی تزئین و آرائش کے سامان، پاوڈر، لپ اسٹک اور کاسمٹیکس وغیرہ اس کو اڑا کر ترقی کے آسمان پر لے گئے ہیں؟ یہ بات اگر نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ اصلاح و ترقی کا نام لینے والے سب سے پہلے انھی چیزوں کی طرف لپکتے ہیں؟ کیوں ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یورپ کی زندگی میں یہ چمک دمک جو نظر آتی ہے یہ دراصل صدیوں کی پیہم جدوجہد کا ثمرہ ہے، اور جو قوم لگاتار محنت اور صبر و عزم کے ساتھ کام کرے اس کی زندگی اسی طرح قابلِ رشک ہو سکتی ہے، جس طرح آج یورپ کی زندگی پر رشک کیا جاتا ہے۔

ان دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک قوم کا کسی دوسری قوم کے لباس و معاشرت کو اختیار کرنا ایک غیر طبعی اور غیر معقول حرکت ہے اور اس میں کسی پہلو سے بھی کوئی معقولیت نہیں ہے۔ معمولی حالات میں کوئی شخص یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر سکتا کہ اس کے گرد و پیش جو عام طریقِ زندگی پہلے سے رائج ہے اسے وہ کیوں چھوڑ دے اور کیوں اس کی جگہ اجنبی لوگوں کا طریقِ زندگی اختیار کر لے۔ اس قسم کے خیالات ہمیشہ غیر معمولی حالات (Abnormal Condition) ہی میں پیدا ہوا کرتے ہیں، اور ان کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے زمانۂ حمل میں بعض عورتیں مٹی کھانے لگتی ہیں یا جب آنکھ کی ساخت میں خرابی آجاتی ہے تو آدمی ہر چیز کو ٹیڑھا دیکھنے لگتا ہے۔

شرعی نقطۂ نظر

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ خالص اجتماعی نقطۂ نظر سے تھا۔ اب ہم شریعتِ اسلام کے نقطۂ نظر سے اس مسئلے پر ایک نگاہ ڈالیں گے۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ وہ ہر معاملے میں وہی طریقہ اختیار کرتا ہے، جو عقلِ عام اور فطرتِ سلیم کے عین مطابق ہے۔ آپ رنگین عینکیں اتار کر صاف نگاہ سے معاملات کو ان کی حقیقی و فطری صورت میں دیکھیے۔ اس طرح کے مشاہدے سے جس نتیجے پر آپ پہنچیں گے وہ بعینہٖ وہی نتیجہ ہوگا، جس پر اسلام پہنچا ہے۔ وہ کوئی خاص لباس اور کوئی خاص طرزِ زندگی انسان کے لیے مقرر نہیں کرتا، بلکہ فطری طور پر جس جس طرزِ زندگی اور وضعِ لباس نے نشو ونما پایا ہے، اس کو جوں کا توں تسلیم کر لیتا ہے۔ البتہ خالص اخلاقی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے وہ چند اصول مقرر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر قوم اپنے قومی لباس اور طرزِ معاشرت میں ان اصولوں کے مطابق اصلاح کر لے۔

ان میں سب سے پہلی چیز ستر کے حدود ہیں۔ اخلاق کے نقطۂ نظر سے اسلام اس کو ضروری سمجھتا ہے کہ تمام مرد، خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کے ہوں، لازمی طور پر اپنے جسم کے ان حصوں کو چھپائیں جو ناف اور گھٹنے کے درمیان ہیں۔ اور تمام عورتیں، خواہ وہ زمین کے کسی خطے میں رہتی ہوں، چہرے اور ہاتھ پاؤں کے سوا اپنے پورے جسم کو مستور[1] رکھیں۔ اگر کسی قوم کی وضعِ لباس ایسی ہو کہ ستر کی یہ شرطیں اس میں پوری نہ ہوتی ہوں تو اسلام اس سے مطالبہ کرے گا کہ اپنی وضع میں ان شرطوں کے مطابق اصلاح کر لے۔ اور جب وہ اصلاح کر لے گی تو اسلام کا منشا پورا ہو جائے گا۔ پھر اس کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کس تراش خراش کا لباس پہنتی ہے۔

دوسری ضروری اصلاح جو اسلام نے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ مرد ریشم کا لباس اور سونے چاندی کے زیورات پہننا چھوڑ دیں۔ اور مرد اور عورتیں سب ایسے لباس پہننے سے احتراز

---

(۱) واضح رہے کہ یہ عورت کے لیے ستر کے حدود ہیں، نہ کہ حجاب کے، ستر وہ چیز ہے جسے عورت کو اپنے شوہر کے سوا ہر ایک سے چھپانا چاہیے۔ خواہ وہ اس کا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اور حجاب اس سے زائد ایک چیز کا نام ہے جس میں قریبی رشتہ داروں اور غیر مردوں کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ اسلام اس کو جائز نہیں رکھتا کہ عورتیں اپنی خانگی زندگی کے حدود سے باہر اپنے حسن اور اپنی آرائش کی نمائش کرتی پھریں۔

کریں جن سے فخر و غرور، بے جا نمائش اور عیش پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ تکبر کے لباس جو زمین پر لٹکتے ہوئے چلتے ہیں[1] اور جنھیں پہن کر ایک انسان دوسرے انسانوں کے مقابلے میں اپنی بڑائی جتاتا ہے، اسلام کی نظر میں لعنت کے قابل ہیں۔ وہ فخر و ریا کے لباس جنھیں پہن کر ایک طبقے کے لوگ عام انسانوں پر اپنی شان اور ترفع کا رعب جماتے ہیں یا اپنی خوش حالی کی نمائش کرتے ہیں اسلام کے نزدیک حرام ہیں۔ وہ بھڑکیلے لباس بھی اسلام کو پسند نہیں جن کے اندر نفس پرستی اور عیاشی کی پرورش ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو اپنی پوشش سے خارج کر دیجیے۔ پھر آپ کے لیے وہی وضعِ لباس اسلامی وضع ہے جو آپ کے ملک میں رائج ہو، یا آپ کی سوسائٹی میں مستعمل ہو۔

تیسری چیز جس کا مطالبہ اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ شرک اور بت پرستی کی وہ مخصوص علامتیں جنھیں کسی مذہبی فرقے نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہو، آپ کے لباس سے خارج ہونی چاہییں۔ مثلاً زنار، صلیب، تصویریں، یا ایسی ہی دوسری چیزیں جو غیر اسلامی شعائر کی تعریف میں آتی ہوں۔

ان اخلاقی و تمدنی اصلاحات کے ساتھ ہر ملک اور ہر قوم کا لباس تقویٰ اور شائستگی کے اس معیار پر آجاتا ہے، جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے لباس میں ایسی کوئی امتیازی چیز ضرور ہو، جس سے وہ غیر مسلموں کے مقابلے میں ممیز ہو سکتے ہوں، تاکہ وہ غیر مسلموں میں خلط ملط نہ ہو جائیں، ایک دوسرے کو پہچان سکیں، اور ان کے درمیان جماعتی زندگی مستحکم ہو سکے۔ اس غرض کے لیے اسلام نے کوئی خاص وضع یا علامت مقرر نہیں کی ہے، بلکہ اسے عرفِ عام پر چھوڑ دیا ہے۔ عرب میں جب اسلامی تحریک کا آغاز ہوا تو خود رسول اللہ ﷺ اور دوسرے مسلمان وہی لباس پہنتے تھے جو عرب کا عام قومی لباس تھا۔ لیکن آں حضرت ﷺ نے مسلمانوں کو مشرکینِ عرب سے ممتاز کرنے کے لیے یہ علامت

---

(۱) اس کی ایک نمایاں مثال وہ مخصوص لباس ہیں جو بادشاہ، پوپ اور پادری، ہائی کورٹوں کے جج اور اسی طرح کے بعض اونچے اہلِ مناصب خاص خاص رسموں کے موقعے پر پہنتے ہیں، اور جو شادی کے موقعے پر دلہنوں کو بھی پہنائے جاتے ہیں۔ یہ لباس اتنا لمبا ہوتا ہے کہ پیچھے کئی کئی آدمی اس کو تھامے ہوئے چلتے ہیں۔ یہی وہ لباس تکبر ہے جس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ "جو شخص غرور کے ساتھ اپنا کپڑا زمین پر لٹکاتا ہوا چلے گا خدا قیامت کے روز اس کی صورت دیکھنا ہرگز پسند نہ کرے گا۔"

تجویز فرمادی تھی کہ مسلمان ٹوپی پر عمامہ باندھیں[1]۔ عام عرب یا تو صرف عمامہ باندھتے تھے یا صرف ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ٹوپی پر عمامہ باندھنا مسلمانوں کے لیے وجہِ امتیاز بن گیا، اور اتنے امتیاز کو اس غرض کے لیے کافی سمجھا گیا کہ اس نئی تحریک کے پیرو اپنے ملک کے عام باشندوں سے الگ پہچانے جاسکیں۔ بعد میں جب تمام عرب مسلمان ہوگیا تو اس علامت کی حاجت باقی نہ رہی، کیوں کہ اب عربی لباس ہی اسلامی لباس بن گیا تھا اور اس لباس کو پہننے والا کوئی شخص کافر و مشرک نہ رہا کہ اسے مسلمانوں سے ممیّز کرنے کے لیے کسی امتیازی نشان کی حاجت ہوتی۔ اسی طرح جب ایران اور دوسرے ممالک میں اسلام پھیلنا شروع ہوا تو اوّل اوّل اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ نومسلم یا تو عربی لباس پہنیں یا اپنے پرانے ملکی لباس میں کسی خاص علامت (مثلاً عمامہ یا خاص طرز کی عبا) کا اضافہ کرلیں۔ کیوں کہ اس وقت ان کا ملکی لباس غیر مسلموں کا لباس تھا، اور بغیر کسی نشانِ امتیاز کے اس کو استعمال کرنے کی صورت میں مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی کسی طرح نہیں بن سکتی تھی۔ مگر جب ان ممالک کے اکثر باشندے مسلمان ہوگئے، اور ان کے ملکی لباس میں وہ اخلاقی و تمدنی اصلاحات نافذ کردی گئیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، تو ان کے مختلف مقامی لباس بعینہٖ اسلامی لباس بن گئے۔ موجودہ زمانے میں بھی جن ممالک کے تمام یا اکثر باشندے مسلمان ہوچکے ہیں ان کے ملکی لباس اپنی مختلف وضعوں کے باوجود سب کے سب اسلامی لباس ہیں۔ اور جہاں مسلم اور غیر مسلم آبادی مخلوط ہے، وہاں ہر وہ لباس اسلامی لباس ہے جسے پہن کر ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم میں تمیز ہوسکے۔ اور جہاں کی ساری آبادی غیر مسلم ہے وہاں ہر اس شخص کے لیے جو اسلام قبول کرے، یہ ضروری ہے کہ عام غیر مسلموں سے ممتاز ہونے کے لیے اپنی وضع میں کسی ایسی علامت کا اضافہ کرلے، جو عموماً اسلامی نشان کی حیثیت سے معروف ہو۔

تشبّہ

اس مرحلے پر پہنچ کر ہمارے سامنے تشبّہ کا مسئلہ آجاتا ہے۔ تشبّہ کے معنی ہیں کسی کے

---

(۱) ابوداؤد، ترمذی اور مستدرک میں یہ روایت آئی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: فَرْقُ مَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْمُشْرِكِيْنَ الْعَمَائِمُ عَلَى الْقَلَانِسِ "ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق کرنے والی چیز ٹوپی پر عمامہ باندھنا ہے۔" بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ یہ تمام مسلمانوں کے لیے دائمی قانون ہے۔ چناں چہ اب بھی بعض لوگ اس فعل کو مسنون قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ محض بے سمجھے حدیث پڑھنے کا نتیجہ ہے۔ دراصل مسنون صرف یہ ہے کہ جب مسلمان کسی ایسی قوم میں ہو، جس کے اکثر افراد غیر مسلم ہوں تو وہ اپنے لباس میں ان سے الگ کوئی امتیازی نشان پیدا کرلے۔

مشابہ بننا۔ اور اس معنی کے لحاظ سے تشبّہ کی چار صورتیں ممکن ہیں، جن میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کے رویّہ کی توضیح یہاں کی جاتی ہے:

(۱) صنفی تشبّہ: یعنی مرد کا عورت کے مانند بننا یا عورت کا مرد کے مانند بننا۔ یہ فعل چوں کہ فطرت سے انحراف ہے، اور ایک بگڑی ہوئی ذہنیت کی علامت ہے، اس لیے اسلام اسے ملعون قرار دیتا ہے۔ آں حضرت ﷺ نے ان مردوں پر جو زنانہ لباس پہنیں اور ان عورتوں پر جو مردانہ لباس پہنیں صاف الفاظ میں لعنت فرمائی ہے۔ اور یقیناً ہر وہ شخص جس کا ذہن صحیح و سلیم ہوگا اس معاملے میں وہی نقطۂ نظر اختیار کرے گا، جو اللہ کے نبیؐ کا نقطۂ نظر ہے۔ مرد میں زنانہ پن اور عورت میں مردانہ پن، خواہ کسی حیثیت سے بھی ہو، ایک نفرت انگیز چیز ہے، جسے دیکھ کر طبیعت بے اختیار بغاوت کرتی ہے۔

(۲) قومی تشبّہ: یعنی ایک قوم کا بہ حیثیتِ مجموعی کسی دوسری قوم کی وضع اختیار کر لینا۔ یہ چیز بھی غیر طبعی اور غیر معقول ہے، اور ہمیشہ ان حالات میں پیدا ہوتی ہے جب کسی قوم میں دناءت کی وبائے عام پھوٹ پڑی ہو۔ لہٰذا اسلام اس کو بھی جائز نہیں رکھتا۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں قومی تشبّہ کی جس طرح روک تھام کی گئی تھی، اور مفتوح ممالک کے باشندوں کو عربیت اختیار کرنے سے جس سختی کے ساتھ منع کیا گیا تھا، اس سے صحیح اسلامی روح کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳) انفرادی تشبّہ: یعنی کسی قوم کے بعض افراد کا کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کرنا۔ یہ دراصل انفرادی سیرت کی کم زوری کا نشان ہے۔ جو افراد اس قسم کی روش اختیار کرتے ہیں وہ دراصل اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ ان کے نفس میں تلوّن کی بیماری موجود ہے۔ ان کی سیرت میں پختگی اور استحکام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک سیّال مادہ کی طرح ہے، جو ہر سانچے میں ڈھلنے پر آمادہ رہتا ہے۔ علاوہ ازیں اخلاقی حیثیت سے یہ ایک مکروہ فعل ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنا نسب کسی دوسرے سے ملائے۔ جس طرح وہ قابلِ ملامت ہے، اس لیے کہ اپنی اس حرکت سے دراصل وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اپنے حقیقی باپ کی اولاد ہونے کو وہ باعثِ ننگ سمجھ رہا ہے، اسی طرح وہ شخص بھی قابلِ ملامت ہے جو پیدا تو ایک قوم میں ہو، مگر عزت و افتخار حاصل کرنے کے لیے وضع دوسری قوم کی اختیار کرے۔ کیوں کہ اس طرح وہ دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ جس قوم نے اسے جنم دیا ہے اس سے وابستہ ہونا اس کی نگاہ میں موجبِ عار ہے اور اس کے نزدیک

عزت کی شکل صرف یہ ہے کہ اس کا شمار دوسری قوم میں ہو۔ تمدّنی حیثیت سے بھی یہ رویّہ سراسر غلط ہے، جو لوگ اسے اختیار کرتے ہیں وہ چمگادڑ بن کر رہ جاتے ہیں۔ نہ اس قوم کے رہتے ہیں جس میں پیدا ہوئے ہیں، اور نہ اس قوم کے بن سکتے ہیں جس کے بننا چاہتے ہیں: لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (النسآء: ۱۴۳) ”نہ پورے اِس طرف ہیں نہ پورے اُس طرف۔“ ان ہی وجوہ سے صحابۂ کرامؓ اور خصوصاً حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے عرب کے ان افراد کو زجر و توبیخ کی تھی، جو بیرونی ممالک میں جا کر عرب کے بدوی لباس چھوڑ بیٹھے تھے اور روم و ایران کے شان دار تمدّن سے مرعوب ہو کر ان کے لباس اختیار کر لیے تھے۔

(۴) تشبّہ بالکفار: یعنی کسی مسلمان کا غیر مسلم کے مشابہ بننا۔ یہ فعل مسلمانوں کی جماعتی وحدت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان اور مسلمان کے درمیان اجنبیت پیدا ہوتی ہے اور ان کے باہمی تعلقات میں وہ تعاون و تناصر نہیں ہو سکتا، جو اسلام چاہتا ہے کہ ہو۔ یہ اس بات کی علامت بھی ہے کہ ایک شخص مسلمان ہونے کے باوجود غیر مسلموں کی طرف میلانِ طبع رکھتا ہے۔ اور سیاسی نقطۂ نظر سے بھی یہ حرکت مضر ہے کیوں کہ اس میں یہ خطرہ ہے کہ جو شخص غیر مسلموں کے مانند بنا ہوا ہے، اس کے ساتھ مسلمان ناواقفیت کی وجہ سے غیر مسلموں کا سا معاملہ کریں گے۔ ان وجوہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس قسم کے تشبّہ کی ممانعت فرمائی ہے: خَالِفُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى، خَالِفُوا الْمَجُوْسَ۔ یہ الفاظ متعدد احادیث میں ہم کو ملتے ہیں جن سے حضورؐ کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان، مسلمان کو دیکھ کر پہچان سکے اور اس کے ساتھ مسلمان کا سا معاملہ کر سکے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جو مسلمان غیر مسلموں میں مخلوط ہو کر رہے گا، میں اس سے بری الذمہ ہوں، یعنی اگر کسی جنگ میں مسلمان اسے دشمن کا آدمی سمجھ کر قتل کر دیں تو اپنے خون کا وہ خود ذمے دار ہوگا۔ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ کا منشا بھی یہی تھا کہ جو شخص کسی قوم کے مشابہ بن کر رہے گا وہ لامحالہ اسی کا فرد سمجھا جائے گا اور اس کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے گا، جو اس قوم کے دوسرے افراد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔